# سقوط ڈھاکہ اور مزاحمتی ناول

## The Fall of Dhaka and the Resistance Novel

ڈاکٹر محمد کامران شہزاد [I]

***Abstract:***

**The most callous and horrendous event in the history of Pakistan is disintegration of eastern Pakistan from the western Pakistan. The external factors as well as internal factors played a pivotal role in this cataclysmic juncture of history of Pakistan. A vast range of the Urdu literature was produced under the influence of this heinous period. Resistance in Urdu novels became an integral after being affected by cultural, social, territorial and demographical norms. This paper deals resistive trends in perspective of disintegration of united Pakistan, its causes and affects upon the society, cultural values, literature and citizens of this exalted land.**

**Keywords:** Disintegration, Pakistan, Literature, Resistance, Hostility, Novel

پاکستان کی تاریخ میں از حد ہولناک اور دل خراش واقعہ مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی ہے۔ تاریخ پاکستان کے جھروکوں میں اس اندوہناک حادثہ میں بیرونی اور اندرونی ذرائع نے اہم کردار ادا کیا۔ اس ناپسندیدہ عہد میں اس کے زیر اثر متفنن اردو ادب تخلیق ہوا۔ تہذیبی، معاشرتی، علاقائی اور شماریاتی معیارات کے زیراثر مزاحمت اردو ادب کا لازمی جز بن گیا۔ یہ مقالہ ان مزاحمتی رجحانات کو پیش کرتا ہے جو کہ متحدہ پاکستان کی تحلیل، اس کی وجوہات، معاشرتی و تہذیبی اقدار اور اس مقدس سرزمین پر تخلیق ہونے والے ناولوں میں نظر آتا ہے۔

**کلیدی الفاظ:** دولخت پاکستان، مزاحمت، دشمنی، اردو ناول

قائد اعظم کی قیادت میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر پاکستان ابھر کر سامنے آیا تو پاکستان مسلم لیگ کو دو صوبوں میں اکثریت تھی۔ ایک صوبہ ہندوستان کے شمال مشرق میں تھا اور دوسرا مشرق میں واقع تھا۔ دونوں حصوں میں جغرافیائی دوری کے سبب لسانی افتراق قیامِ پاکستان سے قبل موجود تھا لیکن قائد اعظم کی قیادت میں متحد تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بھی ہندوؤں نے اور پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور آغاز میں ہی اس کو توڑنے کی منظم سازشوں کا آغاز کر دیا پاکستانی حکمرانوں کی پالیسیوں اور فیصلوں سے اُنھیں مشرقی پاکستان میں منظم سازش کرنے موقع فراہم کیا:

---

I چھٹہ ٹاؤن لاہور روڈ، سرگودھا

''جب اُنھوں نے دیکھا کہ نامساعد حالات کے باوجود پاکستان اپنی بقا و استحکام کی کوشش کر رہا ہے تو اُنھوں نے اسے ختم کرنے کے لیے ایک منظم اور طویل المدت منصوبہ تیار کیا۔ بھارتی رہنماؤں نے پاکستان کے جغرافیائی، تہذیبی اور اقتصادی عوامل کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے بعد مشرقی پاکستان کا انتخاب کیا۔''[۱]

مغربی پاکستان کے سیاست دانوں اور مقتدر طبقے کی مفاد پرست پالیسیوں کے سبب ہندو اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں مغربی پاکستان کی عوام اور حکمرانوں کے خلاف نفرت کے بیج بونا شروع کر دیے اس سلسلے میں آغاز لسانی اختلاف سے ہوا جو بڑھتے ہوئے نسلی، جغرافیائی اور اقتصادی اختلافات تک پہنچ گئے اور پاکستانی حکمرانوں نے ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے ان سے آنکھیں چرانے لگ گئے تو بنگالی صرف احتجاج تک محدود رہے اور پھر سماجی اور معاشی برابری کے لیے الگ خطے کے لیے جتن کرنے لگے۔

ملک میں پہلا مارشل لا لگنے کے بعد ایوب خاں نے مشرقی پاکستان کی محرومی کو کم کرنے کی سعی کی۔ مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری کے پر توجہ دی لیکن اس کے باوجود بنگالیوں کے دل مغربی پاکستان کے لیے نرم نہ ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی جس نے بنگالیوں پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کے سبب الگ ریاست کا حصول ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ جنگ کے فوراً بعد عوامی مسلم لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن نے چھے نکات تیار کیے جس میں مشرقی پاکستان کو خود مختاری دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ دفاع اور خارجہ کے علاوہ تمام حکومتی شعبوں کے اختیار صوبوں کو منتقل کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

حکومت مخالف اٹھنے والی تحریک جب شدت اختیار کر گئی تو جنرل ایوب خان کے اقتدار جنرل یحییٰ کو منتقل کر کے رخصت ہو گئے اور یحییٰ خاں نے ۱۹۷۰ء میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ اسی اثنا میں مشرقی پاکستان میں آنے والے سیلاب کے سبب بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی تو شیخ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان کے خلاف الزام تراشی پر اتر آئے۔ وہ (مجیب الرحمٰن) علاقے میں بھی جاتے وہاں مغربی پاکستان کی قیادت کو گالیاں دیتے

کہ اسلامی ممالک اور دنیا بھر سے متاثرین سیلاب کے لیے آنے والے سامان کو مغربی پاکستان والوں نے ایرپورٹ پر روک رکھا ہے۔ عوامی مسلم لیگ کی چلائی گئی انتخابی مہم میں ہندوستان نے دل کھول کر سرمایہ لگایا اور دوسری طرف شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی تقریروں میں مغربی پاکستان کے خلاف دل کھول کر پروپیگنڈا کیا۔

انتخاب میں مشرقی پاکستان سے بھٹو کی پارٹی اور مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ دونوں رہنماؤں کی اقتدار کی ہوس کے نتیجے میں عوام کے دلوں میں نفرت شدت اختیار کر گئی مشرقی پاکستان کے عوام شیخ مجیب الرحمٰن کے کہنے پر آئے روز ہڑتال کا اعلان کرتے یہاں تک کہ ۳مارچ ۱۹۶۱ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس ہونا تھا تو ۲مارچ کو شیخ مجیب الرحمٰن نے ہڑتال کا اعلان کر دیا اور پورے مشرقی پاکستان میں یوم سیاہ اور فوج کے خلاف مظاہرے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے ۴مارچ ۱۹۷۱ء کو سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کیا تو پورے ملک میں خوف وہراس پھیل گیا۔ پاکستانی پرچم نذر آتش کیا گیا اور بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا کر یوم مزاحمت منایا گیا۔ ڈاکٹر بشیر منصور اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''۴مارچ ۱۹۷۱ء کو پورے صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر دیا گیا۔۔۔۔ جگہ جگہ پاکستانی پرچم نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ ۷مارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمٰن نے متوازی حکومت کا اعلان کر کے لوگوں کو ٹیکس دینے سے منع کر دیا۔۔۔۔ ۲۳مارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمٰن کی رہائش گاہ سمیت سیکریٹریٹ اور دیگر عمارتوں پر بنگلا دیش کا جھنڈا لہرا کر یوم مزاحمت منایا گیا۔'' [2]

مشرقی پاکستان میں عوام کا یوم مزاحمت منانے کے انداز کو توصیف احمد خاں اچھوتے الفاظ میں بیان کر رہے ہیں:

> ''مشرقی پاکستان میں گھر گھر بنگلا دیش کے پرچم لہرا رہے تھے اس کے حق میں نعرے لگائے جا رہے تھے مغربی پاکستان اور فوج کے خلاف دشنام طرازی کی جا رہی تھی، قائدِ اعظم کی تصاویر جلائی گئیں، مخالفین کو قتل کیا گیا اور غیر بنگالی لڑکیوں کو اکثر مقامات پر اجتماعی زیادتی

کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ایک پاکستان کی بات کرتی تھیں۔ یہ دن اصل میں عوامی لیگیوں کے لیے یوم مزاحمت تھا۔" [3]

حالات خراب ہونے کے باعث ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو فوجی آپریشن کا آغاز کیا اور شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔ دنیا کے سامنے یہ تاثر پیش کیا گیا کہ پاکستانی فوج اپنے ہی شہریوں پر گولیاں برسا رہی ہے جبکہ حقائق بالکل اس کے منافی تھے ہندوستان کی منظم سازش سے تیار تنظیم مکتی باہنی کی کارروائیوں نے فوج کو گولی چلانے پر مجبور کیا اور بنگالی عوام اپنی ہی فوج کے خلاف مظاہرے کر رہی تھی جس کے نتیجے میں فوجی آپریشن شروع کر دیا گیا۔ فوجی آپریشن اور بنگالی عوام کی مزاحمت کا نتیجہ پاک بھارت جنگ کی صورت میں سامنے آیا جس کا انجام سقوط ڈھاکہ کی شکل میں ہوا جب جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

سانحہ سقوطِ ڈھاکہ نے جہاں ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا وہاں ملک کے حکمرانوں اور عوام کو مفلوج کر دیا جس کے اثرات دیر پا رہے سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات ہمارے ادیبوں کے سیاسی جغرافیائی شعور میں مرتب ہوئے اور ہمارے ہاں کئی بڑے ناول نگاروں سانحہ سقوطِ ڈھاکہ پر ناول لکھے ان میں طارق محمود کا اللہ میگھ دے، سلمیٰ اعوان کا تنہا، عبداللہ حسین کا نادار لوگ، مستنصر حسین تارڑ کا راکھ، حمید شاہد کا مٹی آدم کھاتی ہے، خالد فتح محمد کا خلیج، رضیہ فصیح احمد کا صدیوں کی زنجیر اور چلتا مسافر شامل ہیں۔ اب ان ناولوں میں مزاحمت کی مختلف صورتوں کو زیرِ بحث لایا جائے گا کہ ہمارے ملک کا حکمران طبقہ، فوج، مکتی باہنی اور بنگالی عوام کی طرف کس نوعیت کی مزاحمت کی گئی۔

سقوط مشرقی پاکستان کے موضوع پر کم و بیش دس ناول لکھے گئے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناول تاریخی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ سانحے سے فرد کی داخلی انتشار کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انسان جو کہ فرشتہ صفت بنے ہوئے تھے، اس سانحے میں تمام تر لبادہ اتار کر سامنے آیا کہیں وہ مخلوق پر مہربان تو کہیں شیطان مزاحمتی حوالے سے سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں اللہ میگھ دے، تنہا، صدیوں کی زنجیر، راکھ، نادار لوگ نمایاں ہیں۔

الطاف فاطمہ کا ناول ''چلتا مسافر'' (۱۹۸۱ء) ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو برصغیر کے مختلف علاقوں میں قیام پذیر ہیں۔ ناول کا مرکز ڈھاکہ ہے، جس میں بنگلا دیش کے قیام سے قبل مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی اختلافات اور رفاقتوں کو پیش کیا ہے سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کے محرکات کی نشاندہی بھی ناول میں کی گئی کہ نسلی تعصب کی بنیاد پر کس طرح مشرقی پاکستان کے استحصال زدہ باشندوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے جس کی مثال پنجابی کرنل کی بیٹی ''سلسبیل'' اور بنگالی نوجوان فضل الرحمٰن کا عشق جو نسلیں متضاد ہونے کے سبب ٹوٹ جاتا ہے علاوہ ازیں ناول میں فوج کی مکتی باہنی کے خلاف کارروائیوں اور بنگالی عوام کے نفرت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ الطاف فاطمہ نے مکتی باہنی اور فوج کے درمیان جاری جنگ میں کربلا کے واقعے کا حوالہ دے کر مزاحمت کے حقیقی روح کو خوبصورتی سے آشکار کیا جو باطل کے خلاف حق کے لیے ڈٹ جانے اور جان قربان کرنے کے فلسفے کی ترجمانی کرتا ہے:

> ''آخر میں اس نے لکھا تھا آپ فکر نہ کریں، آپ پر قربان ہو جاؤں گا۔ رسم شبیری نبھاؤں گا عید کی خوشیوں میں مجھے اپنی یادوں میں شریک رکھیے گا سب چھوٹوں بڑوں اور اہل محلہ کو سلام
>
> آپ کا بیٹا عثمان''
>
> آگ و خون کا اتنا زبردست کھیل دیکھ کر بھی موت کے جنگل میں بیٹھ کر بھی وہ بے اختیار اس کی شہادت پر آنسو بہاتے رہے۔''[4]

طارق محمود کا ناول ''اللہ میگھ دے'' (۱۹۸۶ء) میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے افسران اور سرمایہ داروں کے ذریعے مشرقی پاکستان کے استحصال کو بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے بنگلا دیش کے عوام کا سیاسی شعور، مغربی پاکستان کے نوجوانوں کی پست ذہنیت کے نتیجے میں بنگالیوں کی شدید نفرت کی عکاسی کی ہے۔

مزاحمتی حوالے سے ناول کو دیکھا جائے تو مشرقی پاکستان کی یونیورسٹی میں طلبا مغربی پاکستان کے سیاست دانوں اور ان کی مفاد پرست پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا کی سوچ کی عکاسی ناول نگار نے اس انداز میں کی ہے کہ مشرقی پاکستان میں سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ طلبا کی برین

واشگ وہ تلخ حقیقت ہے، جس کی طرف عام فرد کا دھیان نہیں گیا۔ یہ اہم فیکٹر ہے جس نے مشرقی پاکستان کے طلبا کے دلوں میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت بھر دی۔ مغربی پاکستان کے سیاست دانوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ طلبا کے احتجاج کے عمدہ تصویر کشی اس اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

> ''میں اس کی شعلہ نوائی کو بڑے غور سے سن رہا تھا ہمارے منہ سے نوالے چھیننے والو! ہم تمھارے منہ سے نوالے اگلوائیں گے! سنار بنگلا کی دولت لوٹنے والو تمہارے حساب کے دن قریب ہیں۔ بنگال کی قسمت سے کھیلنے والوں تمھاری جاہ کی بنیاد ہمارے خون پر رکھی گئی ہے اب یہ خون جوش کھا رہا ہے، ابل رہا ہے! بھوک اور افلاس اب ہمارا مقدر نہیں۔ بنگال جاگ چکا ہے۔ ہم نے برابری کی بنیاد پر رشتہ جوڑا۔ تم نے آقا کا روپ دھار لیا۔ ہمیں ٹھوکر کی نوک پر دھر لیا۔ ہم اور ٹھوکریں نہیں کھائیں گے۔''[5]

پاکستانی معاشرے کا المیہ ہے کہ طلبا کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن تخریبی مزاحمت کی راہ پر ان کو لگانے والے ماسٹر مائنڈ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ یہ طلبا اپنی ہی مادر علموں کو طاقت کے نشے میں دھت نقصان پہنچا کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ناول نگار نے کرب ناک انداز میں اس الم ناک واقعے کی تصویر کشی کی ہے جہاں دو مسلح طلبا تنظیموں کے درمیان جاری جنگ میں مادرِ علمی کا نقصان ہوا:

> ''پھر ایک دوپہر اقبال ہال سے چند مسلح طلبا نے سلیم اللہ ہال پر باقاعدہ دھاوا بول دیا۔ سلیم اللہ ہال کے طلبا نے بھی کمال حیرت سے جی کھول کر ہاکیوں اور لاٹھیوں کا آزادانہ استعمال کیا۔ میں کمرے میں دبکا بڑی دیر تک چیخ پکار سن رہا تھا جب شور کم ہوا تو میں نے دروازہ کھول کر باہر نظر دوڑائی کئی کمروں کے شیشے ٹوٹے پڑے تھے۔ سامان کتابیں باہر بکھری پڑی تھیں۔ فضا میں کشیدگی بڑھ گئی تھی اور کئی لڑکے شہر میں اپنے عزیز و اقارب کے ہاں منتقل ہونا شروع ہو گئے۔''[6]

ناول نگار نے مختصر الفاظ میں میجر طفیل شہید نشانِ حیدر کی کتھا بھی بیان کی ہے۔ جنھوں نے وطن عزیز کی حفاظت کی خاطر ملک دشمن قوتوں سے لڑتے ہوئے جان کی بازی لگائی۔ اس کی مکمل تفاصیل سے قاری

کو روشناس کروایا ہے۔ بنگالیوں کے میجر طفیل کے جذبہ حریت کو سلام کی تصویر کشی بھی دل آویز انداز میں بیان کی ایک جملے میں مشرقی اور مغربی پاکستان کو دو الگ وطن سمجھنے والے بنگالی کے ذہن اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی بھی حقیقی انداز میں کی گئی ہے۔

''موتی نے میری نظروں کو بھانپا۔۔ یہ ایک شہید کی یادگار ہے۔۔ بھاشا تحریک کا شہید۔۔۔!

نہیں صاحب یہ اس آندولن کا شہید نہ تھا

تو پھر!

یہ لکشمی پور کی سرحد پر شہید ہوا تھا بڑی بے جگری سے لڑا تھا اس کی شہادت کے بعد شہر والوں نے یہ یادگار تعمیر کی۔ میں سر اس وقت بہت چھوٹا تھا جب اس کی شہادت کی خبر سنی۔

آپ ہی کے دیش کا تھا! موتی نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا میرے دیش کا!

ہاں سر ویسٹ پاکستانی تھا۔ پر بڑی بے جگری سے لڑا تھا۔

کیا نام تھا!

سر میجر طفیل۔''[7]

سلمیٰ اعوان کا ناول ''تنہا'' (۱۹۸۹ء) سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جس میں ۱۹۴۷ء کے دور میں بنگال کے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بنگالی زبان کو ثقافتی ورثہ سمجھتے ہیں۔ قائداعظم کا ڈھاکہ یونیورسٹی میں اُردو کو قومی زبان کا درجہ دینے پر بنگالیوں کی زبان کو صوبائی اور علاقائی سطح پر درجہ دینے کی تحریک نے زور پکڑا لسانی اعتبار سے تحریک مشرقی پاکستان کی یونیورسٹی میں موجود طلبا نے شروع کی جو شدت اختیار کر گئی۔ مصنفہ نے مجتبیٰ الرحمان کا کردار تشکیل کیا، جو بنگلا زبان کو قومی زبان کا درجہ دینے کی تحریک میں پیش پیش رہا۔ کچھ عرصہ تو یہ تحریک دب گئی مگر تھوڑے عرصے بعد ہی دوبارہ سر اٹھا لیا۔ حکومت پاکستان نے اس تحریک کو طاقت کے بل بوتے پر دبانے کی کوشش کی تو حکومت اور مظاہرین کے درمیان محاذ آرائی شروع

ہو گئی۔ سلمیٰ اعوان نے اپنے ناول میں نئی اور پرانی نسل کے لوگوں کے درمیان خیالات کے اختلاف کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ڈاکٹر بشیر بدر مشرقی پاکستان میں لسانی تحریک کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''زبان کے مسئلے نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے اندر ایک نئے احساس کو جنم دیا اور وہ قومی دھارے سے کٹ کر سوچنے پر مجبور ہو گئے۔''[8]

سلمیٰ اعوان نے عام بنگالی آدمی کی مزاحمتی سوچ کی منظر کشی جس انداز میں کی ہے وہ اگرچہ سادہ اور عام فہم لیکن اس کی تہہ میں چھپی کرب ناکی کو سلمیٰ نے جن الفاظ کے پیرائے میں بیان کیا وہ چشم کشا ہے۔ بنگالیوں کی پاکستان سے نفرت کا اظہار انتہائی کرب ناک انداز میں دیکھا:

> ''اور جب وہ سوکھا مریل سا چھوکرا اس سے کرایہ لینے کو آیا تو اس نے بے رخی سے پیسہ اس کی طرف پھینکا اور اپنے ساتھی سے بولا!۔۔۔۔ ''نور الانوار! اب تو پاکستان بن گیا ہے یہ داس بابو کب دفع ہو گا؟''[9]

بنگالیوں کو ذہنی طور پر مزاحمتی رویے کی طرف راغب کرنے میں اُردو کو بطور سرکاری زبان نافذ کرنے کے اعلان نے بھی شاید اہم کردار ادا کیا کیونکہ بنگلا بنگالیوں کی زبان تھی اور بنگال رقبے اور آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے بڑا تھا سلمیٰ نے عمیق مشاہدے کی وجہ سے لاجواب منظر کشی کی ہے۔ سلمیٰ نے مزاحمت کی طرف گامزن عام بنگالی کے ذہنی رویے کی عکاسی ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ''وہ مدھم آواز میں بڑبڑا رہے تھے۔اس نے غور سے سنا اور سمجھا۔۔۔۔ ''تم اس قوم کے نجات دہندہ ہو جو صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی چلی آئی ہے۔ جن کی آواز اور رائے کا ہمیشہ گلا گھونٹا گیا ہے پر تم سے ہمیں اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ عروج کی طرف جاتی یہ زبان اب تمہاری بے اعتنائی سے ختم ہو جائے گی۔ آنے والی نسلیں نذرالاسلام کو بھول جائیں گی۔انہیں جسیم الدین یاد نہیں رہے گا،وہ ٹیگور کو نہیں پڑھ سکیں گے۔''[10]

اُردو زبان کے بطور سرکاری زبان نفاذ کے فیصلے نے بنگالیوں کو بدل کر رکھ دیا تھا انہوں نے مختلف پلیٹ فارم پر اپنی نئی آنے والی نسل کے اذہان میں مغربی پاکستان سے نفرت کے بیج بوئے اس سارے المیے کی لفظی تصویر کشی سلمیٰ اعوان نے دلدوزی سے کی ہے:

''جلد ہی طلبا کا گروہ آگیا اور اس کے ساتھ ہی اسکول میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ جوشیلی تقریروں کا آغاز ہوا۔ آتشیں جذبات نے معصوم اور کم عمر لڑکوں کے چہروں کو تپا ڈالا تھا۔ ان سب کے بعد وہ آیا۔ اس کی آنکھیں اندرونی غضب سے کئی بار اُبلیں اور ڈھاکا یونیورسٹی کے لڑکوں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکا جو ابھی چودہ پندرہ کے پیٹے میں ہے نذرالاسلام کی ''ودردہی'' کی مکمل تفسیر ہے۔''[11]

جب مجتبیٰ الرحمٰن حاکم ضلع کے پاس شکایت لے کر جاتا ہے جو کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھتا ہے وہ بنگالی کو نکمے اور ذلیل کہہ کر نکل جانے کو کہتا ہے اور سست اور کاہل قوم کہنے پر مجتبیٰ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مجتبیٰ کا اس کو خوش اخلاقی سے پیش آنے کا کہنے پر حاکم کے ملازمین نے مار مار کر بھر کس نکال دیا بعد ازاں دھکے مار مار کر نکال دیا گیا۔[12]

بنگالیوں کو مزاحمت کی راہ اپنانے پر پاکستانی بیوروکریسی کے نمائندوں نے بھی مجبور کیا تھا۔ بنگالی یہ سمجھتے تھے کہ ملک کی زرعی آمدنی کا بیشتر حصہ بنگال کی سرزمین سے جاتا ہے۔ اس کے باوجود مغربی پاکستان کے جاگیر دار طبقہ اور بیوروکریسی بنگالیوں کو گھٹیا سمجھتے ہیں۔ ناول میں بنگالیوں کی نفرت کا اظہار یوں کیا ہے:

''دفع ہو جاؤ یہاں سے !نکمے ذلیل لوگ، مانگنے کے سوا تم لوگوں کو اور بھی کچھ آتا ہے؟''

''میں مانگنے نہیں آیا''۔۔۔۔اس کڑے وار کو وہ برداشت نہ کر سکا تھا۔ تلملاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''تو اور کیا کرنے آئے ہو؟ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا ناک میں دم کر رکھا ہے اس سست ذلیل قوم نے۔۔۔۔۔۔''

''تم کچھ نہیں کر سکتے ہو پر خوش اخلاقی سے بول تو سکتے ہو یا یہ بھی مشکل ہے؟''

''پکڑو اس حرامزادے چھو کرے کو''۔۔۔۔ وہ اسے بھاگتے دیکھ کر ملازموں پر دھاڑا اور وہ پکڑا گیا۔ رات کے اندھیرے میں جب اسے دھکے دے کر باہر نکالا گیا تو اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں سوجی ہوئی تھیں اور جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ گرتا پڑتا وہ ساحل پر پہنچا، لنگر انداز کشتیوں میں لالٹینیں جل رہی تھیں۔''[13]

کسی بھی ملک میں جب اپنے ہی بنیادی فرائض سے کوتاہی برتیں تو فائدہ دشمن کو ہوتا ہے اور وار کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کو اپنے سے کم تر سمجھنے کی شرمناک حرکت نے ہندوؤں کو موقع دیا کہ وہ مسلمانوں میں نفرت کا بیج بوئیں۔ سلمیٰ نے اس کارروائی کو عمدگی سے قلم بند کیا ہے۔[14]

آزاد مملکت کے بعد جلد ہی اُردو زبان کو قومی زبان قرار دینے کے خلاف مزاحمتی رویہ اور لسانی تعصب کے سبب بنگالیوں کے ہونے والے نقصان نے پاکستان کے ایک حصہ مشرقی پاکستان کو تقسیم کے چند برس بعد ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور اس میں اشتعال انگیزی اُردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دینے پر آتی ہے جبکہ بنگالیوں کا یہ نقطۂ نظر تھا کہ زبان علاقائی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لیے صوبائی سطح پر زبان کو سرکاری زبان قرار دینا چاہیے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں قائدِ اعظم کے اعلان کے بعد ہی بنگالی عوام نے تحریک چلائی کہ بنگلا زبان ہماری سرکاری زبان ہے اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بنگلا آمار بھاشا''۔۔۔۔ (بنگلا ہماری زبان)
حلق پھاڑ کر وہ چلایا۔ اس کے دائیں بازو کا گھونسا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ گلے کی پھولی نیلی رگیں نمایاں تھیں اور اس کی سرخ آنکھوں سے دیوانگی مترشح تھی۔''[15]

ناول نگار نے بنگالیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ذلت آمیز سلوک اور اس میں ملوث صوبائی حکومت کے کارندوں اور بیوروکریسی کا احوال کربناک انداز میں بیان کیا ہے:

''وہ بہت غصے سے بولی۔۔۔۔ ''میں کہتی ہوں ہماری قوم کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟، یہ ہاتھ جو اپنے ہی جگر گوشوں پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ ٹوٹ کیوں نہیں جاتے؟، یہ پچھمی پاکستان والوں سے اتنا خائف ہیں؟''

اور نورالنہار نے آہستگی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ''فردوسی! اتنا اونچا کاہے کو بولتی ہو۔ نوکری سے ہاتھ دھونے ہیں تمھیں؟''

''پر تم ہی بتاؤ! ان خون سے لتے پتے زخمیوں کو دیکھ کر دل نہیں کٹتا! یہ ہماری متاع ہے، جسے ہم یوں ضائع کر رہے ہیں۔''[16]

یہ بات کسی حد تک درست تسلیم کی جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی عوام میں مغربی پاکستان کی عوام کے لیے نفرت کا پہلو اجاگر کرنے میں ہندوؤں کا کردار بھی نمایاں ہے کیونکہ ہندو دھرم بھی بنگلا دیش کو ہندوستان کے ساتھ ملانا چاہتے تھے اس پہلو کی تصویر کشی سلمیٰ اعوان نے کی بنگال میں ہونے والی مزاحمت میں ہندوؤں کے کردار کو سلمیٰ نے ناول میں بیان کیا ہے۔[17]

بنگالی عوام لسانی تعصب کے سبب مغربی پاکستان کی عوام سے نفرت کا اظہار بھی سلمیٰ نے ناول میں بیان کیا ہے۔ سومی جو نسوانی کردار ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایم اے کرنے جاتی ہے اور بنگلا کلچر اور مشرقی پاکستان کے مسائل سے دلچسپی رکھتی تھی بنگالی کرنل محسن کا خط پڑھ کر نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

''میں نہیں جانتا کسی کرنل ورنل کو اور تُف ہے! پچھمی دیش کی ان الٹرا ماڈرن لڑکیوں پر جنھیں ہمارے مسائل میں بھی گلیمر نظر آتا ہے اور جو اسے اتنی ہی دلچسپی ہے بنگلا کلچر سے تو یہ اپنے اُن کولونیل مزاج کے انکلوں سے کیوں نہیں پوچھ لیتی جو یہاں ہم پر حکومت کرنے آتے ہیں۔ وہ ناک چڑھا چڑھا کر اس کی تفصیلات بتانے میں بلاشبہ فخر محسوس کرتے ہیں۔''[18]

چنانچہ سلمیٰ کا مشاہدہ عمیق ہے۔ اس لیے وہ لوگوں کی نفسیات سے آگاہ ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں انہوں نے کرداروں کے مکالموں کی ادائیگی میں مزاحمتی عناصر کی موجودگی کو طشت از بام کیا ہے وہیں نوجوانوں میں پاکستان سے نفرت اور محبت کے جذبات کو بھی عمدگی سے بیان کیا۔ بنگال کی زیادہ تر آبادی پاکستان کو بطور آقا دیکھنا چاہتی تھی اور پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی جو ممکن نہ ہوا۔ سلمیٰ نے اس ناول میں سلمان ایسے کرداروں سے بھی متعارف کروایا ہے جن کے ذریعے پتا لگتا ہے کہ بنگالیوں کی سرشت میں نفرت اور لسانی

تعصب نے انسان دوستی اور اخلاقی اقدار بھی چھین لی تھیں۔ سمعیہ کا لسانی تعصب اور مجموعی طور پر بنگالیوں کی نفرت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جہاں ان کی اخلاقی اقدار اور انسان دوستی سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ وہاں ہی بنگالی عوام کے دلوں میں مشرقی پاکستان کی عوام سے نفرت میں بنگال کے اندر موجود یونیورسٹیوں میں طلبا سیاسی سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں۔ سلمیٰ نے یونیورسٹی میں طلبا سیاست کے نام پر سیاست دانوں کے چہروں دستو اور معصوم ذہن کو زہر آلود کرنے کی بھیانک سازش کو بے باک الفاظ میں صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔[19]

زبان کسی بھی معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے بنگالیوں میں اُردو زبان کو قومی زبان کا درجہ ملنے کے بعد نفرت حسد اور تعصب کو پروان چڑھانے میں لسانی تعصب کا اہم کردار ہے کیونکہ ان کے نزدیک پاکستان کے بنگال میں سب سے زیادہ رقبہ اور آبادی والا صوبہ تھا تو اُردو زبان کو قومی درجہ ملنے سے ہماری شناخت گم ہو جائے گی لہذا ایسا محسوس ہوگا کہ اُردو زبان کی ترقی سے ہم کسی طور زبان کی آبیاری کر رہے ہیں:

> ''بھئی! اپنی زبان کی نشوونما کرنے کی بجائے ایک غیر زبان کی آبیاری جو کر رہی ہیں آپ۔''
> ''غیر زبان!''۔۔۔۔۔اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا، اس کے ہاتھ میں پکڑا کپ لرزا تھا۔ اس کے شاداب چہرے پر غم و غصہ کا ایک سایہ لہرایا تھا۔ اپنی آواز میں تیزی اس نے خود محسوس کی جب اس نے یہ کہا تھا۔ معاف کیجئے گا، اُردو کے لیے آپ نے غیر کا لفظ استعمال کر کے انتہائی تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ہماری اپنی زبان ہے، یوں اس کے ساتھ ''ہماری'' کی تخصیص کچھ موزوں بھی نہیں، یہ تو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان ہے، اس کی آبیاری کچھ پنجاب والوں نے نرالی نہیں کی، اسے تو بنگال نے بھی پروان چڑھایا ہے۔''[20]

عبداللہ حسین کے ''نادار لوگ'' (۱۹۹۶ء) کا ایک موضوع سقوط ڈھاکہ بھی ہے۔ ''نادار لوگ'' سانحہ مشرقی پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کے اتار چڑھاؤ کی اذیت و کرب سے بھرپور داستان ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے قبل انتخابات میں ہونے والی کشمکش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حکمرانوں نے مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کا آغاز کر دیا تھا، جو ملک دولخت ہونے کا اصل سبب بنا۔ یہ جنگ کسی کشمکش سے کم نہیں تھی۔ ایک طرف

مقامی باغی تنظیم مکتی باہنی تھی تو دوسری طرف ہندوستان تیار بیٹھا تھا کہ موقع ملے اس جنگ میں دونوں اطراف سے نقصان پاکستان کو ہو رہا تھا ایک طرف اسی سرزمین کے باسی بنگالی مر رہے تھے تو دوسری طرف اسی پاک سرزمین کی فوج کے اہلکار جنگ میں دوست اور دشمن کی تفریق ختم ہو گئی۔ اس ناول کا بیشتر حصہ مغربی پاکستان کے جنوبی دیہات اور قصبوں سے تعلق رکھتا ہے تاہم عبداللہ حسین ان قصبوں اور دیہاتوں کے مسائل کو شہری و ملکی مسائل کے ساتھ ایک متوازن سطح پہ اُستوار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دیہات کے انہی کسانوں اور مزدوروں کو اپنے بنیادی کرداروں کی شکل میں ڈھالتے ہوئے عبداللہ حسین نے ملک کے اُس وقت کے داخلی انتشار اور عدم استحکام کی بنیادی وجوہات کا بھی تعین کیا ہے۔ نادار لوگ کے میجر سرفراز اور ان کے ساتھیوں کو انھی حالات کا سامنا کرنا پڑا، وہ کہیں شہید ہوئے دکھائی دیے تو کہیں زخمی۔ انسانی جبلت انتقامی طاقت اور مزاحمتی رویہ اپنا چکی تھی ناول میں میجر سرفراز کا کردار مشرقی پاکستان کی موجودہ بے یقینی کی صورت حال سے نالاں بھی نظر آیا اور رنجیدہ بھی، جب معصوم اور بے ضرر لوگوں کے سردار جس نے ہتھیار پھینک دیے تھے اس کو قتل کرنے پر میجر سرفراز کی کرنل کے خلاف شدید مزاحمتی انداز اپنایا۔[21] بنیادی طور پر نادار لوگ ایک ایسی نادار قوم کی کہانی ہے، جو نسل در نسل غلامی کا طوق پہنے' اپنے اوپر مسلط کیے جانے والے ہر ڈکٹیٹر' سیاست دان یا جاگیر دار کے آگے اپنا سر خدا کے سامنے جھکا دیتی ہے۔

ہماری تاریخ کا یہ بھی بہت بڑا المیہ ہے کہ ہماری فوج کے افسران میں نظریاتی اختلاف دیکھنے کو آئے میجر سرفراز جو کہ انسانیت کا ہمدرد تھا اس کو درندوں جیسا سلوک کرنے پر میجر نواز کھوکھر کے خلاف میجر شرفی کی مزاحمت کو بھی عمدگی سے بیان کیا ہے۔[22]

مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''راکھ''(۱۹۹۷ء) میں پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کو موضوع بنایا گیا ہے، جس میں مرکز سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ رہا ہے۔ بنگالی زبان سے ناآشنا مغربی پاکستان کے فوجی عام بنگالیوں کو مکتی باہنی کا فرد سمجھ کر گولیاں مارتے رہے، جو بنگالیوں کے دلوں میں نفرت کا باعث بنی تھی پاکستانی اشرافیہ اور فوج حالات کا درست تناظر میں اندازہ نہیں کر سکی تھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کا آدھا حصہ تو ہاتھوں سے گیا دلوں

میں نفرت بھی پیدا ہو گئی۔ اس خلیج کو کوئی پاٹ نہ سکا اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مستنصر نے بنگال میں مکتی باہنی کی مزاحمت کا جو سبب بتایا ہے۔ وہ حیرت انگیز ہے۔ پاکستان آرمی کے چند نوجوانوں نے محض اپنے قیاس کی بنیاد پر بنگالیوں کو ہندو گردان کر ان کی جھونپڑیوں کو نذر آتش کر دیا اور کلمہ پڑھنے کے باوجود خوف اور دہشت کی وادی میں سفر کرتے نوجوانوں کو محض شک کی بنیاد پر گولیوں سے بھون دیا۔ مستنصر نے سقوطِ ڈھاکہ کے دوران پھیلنے والے خوف اور دہشت کو بھی ناول کے بیانیے میں شامل کیا ہے۔[23]

مستنصر نے آرمی کے بنگالیوں کو مکتی باہنی کے کارکنوں کے مارنے اور جواب میں مکتی باہنی کے غنڈوں کے بہاری مسلمانوں کے بے دردی سے قتل عام لڑکیوں کی عصمت دری کی خونچکاں واقعات کو کرب انگیز انداز میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے، بیانیہ گنجلک ہے البتہ امیجری اتنی متحرک ہے کہ قاری خود کو سقوط ڈھاکا کے درد میں محسوس کرتا ہے:

''وہ دوسرے کمرے میں گیا۔۔۔ باب صاحب کی سٹڈی میں۔۔۔ اُن کے دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں الگ الگ۔۔۔ بک شیلف میں کسی ورک آف آرٹ کی طرح سجے تھے۔۔۔ ڈیکلائن اینڈ فال آف سی رومن ایمپائر کے برابر میں ایک بازو۔۔۔ دس سپوک زر تشترا کے قریب دوسرا ہاتھ۔۔۔۔ ایک ٹانگ بالکل پرفیکٹ حالت میں فسانہ آزاد کے اوپر اور دوسرا دیوانِ غالب کے صفحات پر۔۔۔ اُن کا دھڑ سٹڈی ٹیبل پر کسی صدارتی ضیافت میں ڈائننگ ٹیبل پر سجے سالم بکرے کی مانند تھا۔۔۔ جس نے بھی انہیں کاٹا تھا نہایت مشاقی سے کاٹا تھا۔۔۔ کہیں کوئی دھاگہ یا تار لٹکتا نہیں تھا۔

اور اُس لونگ روم کی پوری دیوار کی شیشہ کھڑکی میں سے بوڑھی گنگا کی وسعت اور ویرانی نظر آتی تھی وہاں عارفین ننگی پڑی تھی۔

ایک سبز پرچم جہاں سے آدم جنم لیتا ہے۔

عارفین کی چھاتیاں جن پر ''جئے بنگلا'' پینٹ کیا گیا تھا۔ جئے کا ایک نقطہ اور بنگلہ کا دوسرا نقطہ پینٹ کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اُبھاروں کے اختتام پر نپل یوں بھی سیاہ ہو رہے تھے۔

اُس کی باچھوں سے خون کی لکیریں گردن تک آتی تھیں اور جم جاتی تھیں۔ عارفین کا سانس چلتا تھا، کیونکہ پرچم ہولے ہولے اوپر نیچے ہوتا تھا۔''[24]

رضیہ فصیح احمد نے اپنے ناول صدیوں کی زنجیر (۱۹۹۸ء) میں مشرقی پاکستان کے سانحہ کو پورے المناک تناظر میں بیان کیا ہے مشرقی پاکستان باسیوں کی المناک حالت، پاکستانی فوجی افسروں کی ذہنی عیاشی اور ایک مغربی پاکستانی لڑکی کی بنگالی لڑکے سے عشق، فوجی افسر کی اس لڑکی سے دوستی کرنے کی خواہش اور نہ کرنے کی صورت میں دھمکی دینے اور اس پر لڑکی کی بھرپور مزاحمت کرنے کی روداد کے ساتھ ساتھ بنگال میں خراب حالات کے ذمہ داروں کی کہانی کو دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لڑکی کا انداز جارحانہ ہے انداز بیان میں دکھ کی کیفیت واضح طور پہ محسوس کی جاتی ہے:

''کسی نہ کسی لسٹ میں آپ کا نام بھی ہوگا' بینو نے دوبدو جواب دیا اور دوبارہ ستار کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہمیں معلوم ہے آئے دن جوئیہ کا کٹیل بم پڑتے ہیں یہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بنائے جاتے ہیں کسی دن ریڈ ہینڈڈ پکڑی گئی تو تمہارے والدین کی وفاداریاں بھی کام نہ آئینگی اچھا یہ بتایئے یہاں نکڑ پر جو گھر ہے اور اکثر آپ لوگوں کی جیپیں وہاں کھڑی نظر آتی ہیں ان کی وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں؟ بینو نے ستار ہاتھ سے رکھ دیا۔''[25]

رضیہ نے ناول میں بنگال میں پیدا ہونے والی کشیدگی کا ذمہ دار فوج کو گردانا ہے۔ کیپٹن جواد اور بینو کے درمیان مکالمہ میں بینو جس طرح کا مزاحمتی انداز اختیار کرتی ہے اس میں بنگال میں سیلاب آنے کے بعد امدادی اشیا کی بنگال روانگی اور اس میں متاثرین کو نہ ملنے بلکہ وہ امدادی اشیا فوجی افسران خود ہضم کر گئے اس لیے بنگال میں صورت حال خراب ہونے کی ذمہ دار فوج کو تصور کیا جاتا ہے۔[26]

قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے بعد بنگال میں حالات خراب ہوئے عوامی مسلم لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمان کی طرف سے ہڑتال کرنے پر فوج کی جانب سے مظاہرین پر گولی چلانے کے جواب میں مظاہرین کا شدید مزاحمتی انداز اپنانے پر دونوں طرف نقصان کے علاوہ عام غیر بنگالی افراد کے قتل عام کی روداد

بھی کربناک انداز میں بیان کی ہے لیکن قاری یہاں اندازہ کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے کہ ایک طرف بنگالی اپنے حقوق کے حصول کے لیے لڑ رہے ہیں جبکہ دوسری جانب فوج اپنے ہی ملک کے دفاع کے لیے عوام پر گولیاں چلا رہی ہے:

> ''دوسرے دن بھی الیاس اور منیر وہیں موجود تھے۔ شیخ مجیب نے پُرامن عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ پر سخت صدائے احتجاج بلند کی تھی، اور مارشل لا کی فوراً منسوخی کے ساتھ ۷/مارچ تک عوامی لیگ کے پروگرام کا اعلان کیا تھا جس میں ۳/مارچ سے لے کر ۶/مارچ تک ہر روز صبح چھ بجے سے دوپہر دو بجے تک مکمل ہڑتال بھی شامل تھی۔ دوسرے دن پھر کرفیو کی خلاف ورزی ہوئی۔ ہجوم نے پتھراؤ کیا۔ گورنمنٹ ہاؤس پر حملہ ہوا گولیاں چلیں۔ کاجل خبر لایا کہ آٹھ نعشیں اقبال ہال میں لڑکوں کے قبضے میں ہیں۔ پانچ پلٹن میدان میں دیکھی گئی ہیں۔ تین گورنمنٹ ہاؤس پر حملہ کرنے والوں میں سے مرے ہیں۔''[27]

رضیہ فصیح احمد نے پٹھان کی غیرت اور بیوی کو بے پردہ کرنے والے بنگالیوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے تنہا مسلح افراد سے لڑ جانے اور پھر موت کی وادی میں جانے کی دردناک کہانی کو المناک انداز میں بیان کیا ہے ناول میں ایک واقعہ بنگالی مکتی باہنی والوں کے اذیت ناک رویے اور غیر بنگالیوں کے ساتھ ان کی نفرت کو واضح طور پر آشکار کرتا ہے پٹھان کی بنگالیوں کے ہاتھوں دردناک موت پر فوجیوں کی خاموشی کیوں کہ مارشل ہیڈ کوارٹر بھی پاس موجود ہیں۔[28]

ناول میں انفرادی مزاحمت کے بادل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کیپٹن جواد کے بینو کی زبردستی عصمت دری کرنے کی کوشش کے جواب میں بینو کی طرف سے کی گئی مزاحمت اور اس کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر آنے والے میجر خالد کے آنے اور کیپٹن جواد کو بے دست و پا کر کے اس کو قابو میں کرنے میں بینو کی عزت بچانے کی کہانی کو رضیہ دلدوزی سے بیان کرتی ہے۔ ناول میں پاکستانی فوجی افسروں میں موجود کالی بھیڑوں کی محض چند لمحوں کی لذت کی خاطر پوری پاکستانی فوج کو کرنے کی کریہہ سوچ کا جو اظہار کیا وہ بہت افسوس ناک ہے۔[29]

انقلاب کی آڑ میں مزاحمت کے تناظر میں جس طرح مشرقی پاکستان میں خون کی ہولی کھیلی گئی وہ واقعات دل دہلا دیتے ہیں افواہوں کے سبب معصوم لوگ مکتی باہنی اور فوج دونوں کی زیادتیوں کا نشانہ بنے۔ احتجاج کے دنوں میں ملکی املاک کی تباہی کا نقشہ درد بھرے انداز میں کھینچا ہے:

''جو مغربی پاکستانی اس زمانے میں مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آ رہے تھے، بتاتے تھے کہ دونوں طرف سے تباہی مچ رہی ہے فوج شر پسندوں کے نام پر غدر مچا رہی ہے۔ مقامی لوگ حکومت سے عدم تعاون کر کے سڑکیں، پل اور ریلوے لائن توڑ رہے ہیں۔ ریل کے ڈبے اور بسیں جل رہی ہیں۔ گاؤں اور کھیت جل رہے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگ مارے جا رہے ہیں۔''[30]

۱۹۷۱ء کی جنگ میں بنگالیوں کی سرزمین پر بھارتی فوج کے شدید حملوں اور پاکستانی فوج کی بھرپور کارروائی اور مزاحمت کے نتیجے میں بھارتی حملوں کے پسپا ہونے کی روداد رضیہ نے دردمند کیفیت سے سنائی ہے اندازِ بیان ایسا کہ قاری اس مسحور کن منظر میں محو ہو جاتا ہے:

''صبح کی پہلی روشنی کے ساتھ چھ بجے پہلا حملہ ہوا جسے پسپا کر دیا گیا۔ دس بجے تک پے در پے حملے ہوئے اور ہر بار انھیں پسپائی کا سامنا ہوا۔ دس بجے کے قریب کرنل مشرف کے پاس دائیں فارورڈ کمپنی کے کپتان جواد کا فون آیا کہ سامنے سے تیزی کے ساتھ دشمن کے ٹینک آ رہے ہیں اور وہ کسی صورت انھیں روک نہیں سکیں گے۔۔۔۔۔ میجر تجمل نے اپنی نظروں کے سامنے ٹینک دائیں طرف سے گزرتے دیکھے، جیسور کی طرف جاتے دیکھے اور یقین ہو گیا کہ پوری پلٹن کپتان جواد سمیت زندہ دفن ہو گئی ہے۔''[31]

محمد حمید شاہد کا ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' (۲۰۰۷ء) ء بھی سقوطِ ڈھاکہ پر لکھا گیا ہے۔ ناول کو ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے اور مشرقی پاکستان کے علیحٰدہ ہو کر بنگلا دیش بننے کے دوران وقوع پذیر ہونے والے انسانی المیے پر اہم دستاویز ہے ناول کی کہانی کا مرکزی کردار بھی فوجی افسر سلیم ہے یہاں بھی فوجی افسر بنگالی خاتون کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے مشرقی پاکستان کی عوام جن تحفظات پر شور مچا رہی تھی ہمارے صاحب اقتدار

طبقے توجہ نہیں دے رہا تھا سقوطِ ڈھاکہ کے مقتدر طبقے نے پلیٹ فارم تیار کیا ہے۔ بھارتیوں کی کہانی بیان کرتے ہیں لیکن تحریر کے باطن میں سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے کو جنم دینے والے کی طرف نشاندہی کی ہے ناول میں بنگال کی صورتحال پر منشایاد لکھتے ہیں:

''یہ زوال انہیں دو بھائیوں کی کہانی ہے اور اپنا ایک علامتی اور استعاراتی رنگ بھی رکھتی ہے یوں تو اس میں حقیقی مشرقی پاکستان ماسکو اور اس پر خیال انگیز اور عبرتناک تبصروں کی پوری شدت سے موجود ہے۔''[32]

''اگر ناول کو مزاحمتی حوالے سے دیکھا جائے تو حمید شاہد کے ہاں مزاحمت کا تعلق انسان کے باطن سے ہے۔ چنانچہ بظاہر راوی جب خان جی سے ملاقات کے لیے آتا ہے تو اپنے خیالات کو ان سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنے والے انسان کے خیالات کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔''[33]

۱۹۷۰ء میں جنرل یحییٰ نے انتخابات کروائے، جس میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی عوامی مسلم لیگ کو جیتنے کے باوجود ان کی حکومت بنانے سے انکار ٹال مٹول کرنے پر بنگالیوں کے دلوں میں نفرت اور بغاوت کے عنصر کو کہانی میں منفرد استعاراتی اسلوب میں بیان کیا ہے بنگالی اور پاکستانی آرمی افسروں کے خلاف ذہنی کیفیت کی عکاسی کو دردمندی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے:

''جسے تم ہمارا بنگلا بندو کہہ رہے ہو نا، اُس کی پارٹی الیکشن میں بھاری اکثریت سے جیتی ہے۔''

میں نے اپنے اس معصوم دوست کو یوں بھڑکتے پہلے بار دیکھا تھا۔ مجھے دم سادھ لینا پڑا۔ ہم سب خاموش تھے یوں کہ ہمارے لقمے لینے کی آواز بھی سماعتوں تک پہنچنے لگی تھی۔ جب جلیل نے اپنے غصے پر قابو پالیا تو کہا:

''جب ادھر کے لوگوں کو الیکشن جیتنے کے بعد بھی اقتدار سے صرف اس لیے محروم رکھا جائے گا کہ ہم بنگالی ہیں تو بنگالیوں کو باغی ہونے سے کون روک سکے گا؟''[34]

بنگالی چاہے پاکستانی فوجی افسر تھے ان کے باطن میں بنگالی عوام کا درد تھا اسی منظر کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ جب بنگالی آرمی افسر کے مکتی باہنی سے رابطوں اور دونوں کے مل کر پاکستانی فوج سے لڑنے اور پاکستانی فوج کی طرف سے جہاں شدید مزاحمت کی داستان حمید شاہد نے سنائی ہے۔ غیروں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں بھائیوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہونے کی روداد کا اظہار یہ بھی المناک انداز میں بیان کیا ہے:

> ''میں جانتا تھا کہ جلیل کے مکتی باہنی والوں سے تب کے رابطے تھے جب وہ چھپ چھپ کر حملہ آور ہوتے تھے۔ اب تو انہوں نے تقریباً شہر پر کنٹرول حاصل کر ہی لیا تھا۔ ہم ان سے متصادم ہوتے رہے تھے، اس جوش اور جذبے کے ساتھ جو ادھر سے ہم ساتھ لائے تھے مگر اب ہمارے اوپر کچھ ایسی افتاد آپڑی تھی کہ ہم جیسے اپنے ہتھیاروں کا بوجھ اس دشمن کے حوالے کرنے کے لیے اٹھائے پھرتے تھے جس کی پوری پشت پناہی مکتی باہنی کو حاصل تھی۔ ہر آنے والا دن ہمیں بوکھلانے کے لیے کافی تھا۔ انہی دنوں میں ایک سیاہ ترین دن وہ بھی تھا جب جلیل کی رجمنٹ سے ہتھیار لے کر اس کے افسروں اور جوانوں کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یوں ہم ان کے رہے سہے تعلق، بچی کھچی محبتوں اور ہم دردیوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔''[35]

محبت میں سرشار منیبہ بنگالی باپ کی پاکستانی فوج کو گھر میں پناہ دینے، مکتی باہنی کے غنڈوں کے گھر پر حملہ کر کے منیبہ کے ماں باپ کو قتل کرنے اور پاکستانی فوجی کو ساتھ لے جانے کی کہانی کو سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ بھی منیبہ کے اپنے شوہر میجر جلیل سے نفرت کا باعث بنتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر میجر سلیم کے ساتھ جانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی سبب مکتی باہنی کے غنڈے اس کو قتل کر کے سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔

فتح محمد کا ''خلیج'' (۲۰۰۸ء) میں سقوط ڈھاکہ کے سانحے کے تناظر میں لکھا گیا ہے خالد فتح محمد کا ناول مشرقی پاکستان پر ایک مستند دستاویز ہے سقوطِ ڈھاکہ پر لکھے جانے والے دیگر ناولوں کی طرح بھی اس ناول کا مرکزی کردار بھی فوجی افسر ہے جو حالات کا سنگینی کا اندازہ لگائے بغیر ایک بنگالی عورت کے عشق میں مبتلا ہو جاتا

ہے۔اس محبت کے پس منظر میں ہوس کا پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ناول نگار نے بھی ناول میں مکتی باہنی فوج اور عوامی مسلم لیگ کے مظاہرین کے درمیان ہونے والی جھڑپوں کو کربناک انداز میں دیکھا گیا ہے۔ناول میں مزاحمتی رنگ اس وقت نمایاں ہوتا ہے، جب مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مکتی باہنی کے ہاتھوں غیر بنگالیوں کے مارے جانے اور اس رد عمل میں فوج کی طرف سے بنگالیوں کے قتل عام کی کہانی کو سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔حالات کو خراب کرنے میں منتقم مزاج اذہان کی طرف سے منفی رویے نے بھی اہم کردار ادا کیا۔اس منفی ذہنی کیفیت اور احساس کی عکاسی عمدگی سے کی گئی ہے:

> ''کرنل بشیر ایک شدید نفسیاتی دباؤ میں سے گزر رہے ہیں۔عوامی لیگ کے کہنے پر یہاں جو بغاوت ہوئی، اُسے گول مال کہتے ہیں۔گول مال میں آپ جانتے ہیں، کیا کچھ ہوا؟ گول مال سے دو دن پہلے جب حالات کسی رُخ بیٹھے نہیں تھے۔کرنل کی بیوی حفاظتی دستے کے ساتھ بازار گئیں۔وہاں اُن پر حملہ ہوا۔اُن کے بازو اور ٹانگیں دھڑ سے جُدا کر دی گئیں۔اُن کے محافظ بھی مارے گئے۔لوگوں کو آزادی کا بلاوا دینے والی جماعت عوامی لیگ کے سر بازوں کے ہاتھوں مرنے والی وہ پہلی مغربی پاکستانی خاتون ہیں۔تب سے کرنل بشیر بدلہ لے رہے ہیں۔وہ بدلہ اور مغربی پاکستانی عورتوں کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ہر آنے والی فلائیٹ کی ہوسٹیسیں اِن کے ہاں ٹھہرتی ہیں۔غالباً انٹر کانٹی نینٹل بھی اتنا ہی محفوظ ہے مگر وہ مطمئن نہیں۔''[36]

مصنف نے مکتی باہنی اور عوامی لیگ کے منتقم مزاج اذہان کی عورتوں کی بے حرمتی بچوں اور عورتوں کے قتل عام مردہ جسم کی بے حرمتی دکھائی ہے علاوہ ازیں بے ہنگم ہجوم کی منتقم مزاج مزاحمت اور فوج کی طرف دفاع کرنے کے ناکام جتن اور فوجیوں اور اور غیر بنگالیوں کے قتل عام کی تصویر کشی بڑے دل دوز سے بیان کی ہے۔[37]

برصغیر پاک و ہند میں نفرت اور بغاوت کے رد عمل میں جہاں تمام لوگوں کا قتل عام دیکھنے میں آتا ہے وہیں عوامی بے حسی کا نتیجہ عوامی اور سرکاری املاک کی توڑ پھوڑ نذر آتش کیے جانے اور تباہ و برباد کیے جانے

کی صورت میں نکلتا ہے خالد فتح محمد نے اس سارے منظر نامے کو دیانتداری سے شیشے میں اتارا ہے، جواب میں فوجیوں کی طرف سے ظلم اور بربریت کا جواب اس سے بھی بڑھ کر ظلم اور بربریت کی صورت میں نکلا مصنف نے فوج کی طرف سے مکتی باہنی والوں اور عوامی لیگ کی حمایت کرنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی شرمناک کارروائی کو بھی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے:

''وہ کئی بستیوں اور قصبوں میں گزرے جہاں بربادی کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ ہر جگہ جلی یا گری ہوئی عمارتیں دیکھنے کو ملتیں اور احساس ہوتا کہ وہ علاقے کسی جھڑپ یا لڑائی کا میدان رہے ہیں۔ جب وہ اُن علاقوں میں سے گزرتے تو لوگ اُنھیں عجیب نظروں سے دیکھتے۔ افضل کو اُن کی نظروں میں بہ یک وقت نفرت، خوف اور ایک حوصلہ نظر آتا۔ یہ نفرت فوج کے خلاف تھی یا مغربی پاکستان کے خلاف؟، شاید خوف اس احساس کا تھا کہ وہ بے سہارا ہیں اور اُن کی مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ اور حوصلے کی وجہ اُن کا خود پر اعتماد تھا۔'' [38]

بنگالیوں کے دلوں میں نفرت پھیلنے کا ایک واضح سبق فوج کی طرف سے سادہ لوح بنگالیوں کا واضح ثبوت کے بغیر قتل عام تھا، مصنف نے اس بات کی نشاندہی کی ہے چنانچہ لیفٹیننٹ شہباز کی طرف سے موجودہ نوجوان کو گولی مارنے کا عمل جو کہ قطعی قابل تحسین نہیں ہے سارے واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ہم میں سے بیشتر وہ کچھ دیکھ چکے ہیں جو ہمیں دیکھنا نہیں چاہیے تھا۔ کبھی یہ سوچتا ہوں کہ دیکھنا ضروری بھی تھا۔ میرا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ میں اُنھیں مارتا نہیں بلکہ اکساتا ہوں کہ وہ اپنے اندر کے غداروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ختم کریں۔ غداروں کی نشان دہی کر دی جاتی ہے اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ کوئی بنگالی تنظیم اُنھیں ختم کر دینا چاہتی ہے۔ یہ ایک سلسلہ چل نکلا ہے۔ اُنھوں نے ایک محدود سی سطح پر ایک دوسرے کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ تمھارے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے۔ باقی تم اپنا طریقہ کار خود نکالنا۔'' [39]

پاکستانی فوج کے بنگالیوں کے ساتھ ناروا سلوک نے نفرت کی آگ کو مزید شدید کر دیا۔ ناول میں بنگالیوں نے فوج اور مکتی باہنی کے درمیان ہونے والی جنگ میں مکتی باہنی سے ہمدردی کا اظہار کیا لفظی عکس بندی

ناول نگار نے ناول میں کی ہے۔[40] قیامِ پاکستان کے بعد ہی ہندوستان کی ہر ممکن کوشش رہی تھی کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کو کمزور کیا جائے جس میں وہ کامیاب بھی رہے ہندوستان اور بنگال کی سیاسی تحریکوں کی مدد سے شر پسند مکتی باہنی فوج کے مقابلے میں عام کھڑی ہوئی دکھ کی بات یہ تھی کہ اس کو بنگالی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ ناول نگار نے مکتی باہنی کی منفی کارروائیوں اور فوج کے خلاف نفرت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''جہاں اُن کی پٹرولنگ میں اضافہ ہوا وہاں مکتی باہنی کی کارروائیاں بھی زیادہ ہو گئیں۔ وہ تقریباً ہر رات پلاٹون کے علاقوں میں کہیں نہ کہیں کارروائی کرتے جو فوجی نوعیت کے بجائے واردات کا رنگ لیے ہوتیں۔ وہ کسی نہ کسی دیہہ میں رات کو چھاپا مارتے اور دولت مند لوگوں کو لوٹتے۔ کئی گھروں سے عورتیں بھی اُٹھا کر لے جاتے۔ جہاں مقامی آبادی پاکستان کی فوج سے نفرت کرتی تھی وہاں وہ مکتی باہنی سے بھی خائف تھی۔ پاکستان کی فوج سے نفرت اُس احساس کا حصہ تھی، جو ان کے اندر سالوں سے سلگتا رہا تھا۔''[41]

بغاوت کے اس عمل میں مکتی باہنی کا ساتھ دینے والی ہندوستانی فوج کے مکروہ کردار کا ذکر بھی خالد فتح محمد نے خوب کیا ہے انکی بے پروائی حکمرانوں کی بے حسی اور فوج کے منفی کردار کا ردِ عمل یہ ہوا کہ بنگالیوں نے انڈیا سے مدد مانگی جس کے نتیجے میں ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔[42] سقوطِ ڈھاکہ پر اتنے ناول نگاروں نے ناول لکھے ان میں سب نے برملا اظہار کیا ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کا ایک سبب ہماری فوج کی عیاش بھری زندگی بھی تھی اسی منظر کی تصویر کشی خالد فتح محمد نے بھی کی فوج کی طرف سے بنگالی خواتین کی عصمت دری بھی مزاحمت کی ایک شکل تھی یا اس کو زندگی سے فرار کا حصہ سمجھ لیجئے ذہنی مایوسی کا اظہار اور مصنف نے فوجیوں اور بنگالی عورتوں کی ذہنی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ بنگالیوں کی بہاریوں کے مثبت کردار کو بھی مصنف نے بیان کیا مکتی باہنی والوں کی غیر انسانی قتل وغارت اور ظلم و بربریت اور بہاریوں کا فطری ردِ عمل ناول کے بیانیے کا اہم حصہ ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ضخیم ناول ''خس و خاشاک زمانے''(۲۰۱۳ء) میں شایع ہوا۔ ناول میں زمان و مکان کا دورانیہ ۱۹۳۰ء سے ۲۰۰۱ء تک محیط ہے ناول میں کہیں کہیں فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے ایسے

موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، جن پر پاکستان میں بات کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ان موضوعات میں تقسیم ہند ناجائز طور پر پیدا ہونے والے بچے مردار گوشت کھانے، ہم جنس پرستی، سقوطِ ڈھاکہ کاالمیہ، مغربی طرز زندگی اور علاوہ ازیں نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والی اسلام دشمن رویوں کی نشاندہی کی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس نے اپنے ناول میں کوزے میں دریا بند کر دیا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ ناول میں جہاں مزاحمت کے رنگ موجود ہیں وہیں سقوطِ ڈھاکہ کے علمی اور پاکستانی فوج کی شکست پر عوام کے تاثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ جہاں کے خیالات کے ذریعے بتا رہا ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ اور جنگ میں شکست ہماری فوج کی خراب حکمت عملی کے سبب ہوئی۔ بخت جہاں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا ہے:

''اُس کی گھوڑی ہنہنائی۔۔اپنی اگلی ٹانگیں اُٹھا کر احتجاج کیا اور پھر اُنہیں زمین پر پٹخ کر دُھول اُڑانے لگی۔ اور اُس دھول کا رنگ بھی سرخی میں ڈھلتا تھا۔۔۔ بخت جہاں کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں الاؤ سلگنے لگے۔۔۔ اُس کی آواز میں گئے زمانوں کا ایک جلال تھا۔۔اوئے بے غیرتا۔۔۔ وہ اُس سے مخاطب ہوا۔ اوئے نامردا۔۔۔ تم نے تو کہا تھا کہ ہندوستانی ٹینک تمہاری لاش پر سے گذر کر ڈھاکے میں داخل ہوں گے۔ اپنی زمینوں کو شریکوں کے نام کر رہے ہو۔۔ایسا تو دنیا پور کا کوئی چُوڑا چمار بھی نہ کرتا۔ مر جاتا پر ایسا نہ کرتا۔۔۔ میز پر صرف تمہاری پیٹی اور ریوالور نہیں پڑے ہوئے۔ان کے ساتھ نوے ہزار ہتھیار بھی گرے ہوئے ہیں جو اُنہوں نے نہیں تم نے شریکوں کے سامنے ڈال دیے ہیں۔ یہ کیا سودا کر رہے ہو۔۔ میرے ہوتے ہوئے تم جو اپنے آپ کو ٹائیگر کہلاتے تھے، بیچ میں سے لومڑ بھی نہ نکلے۔۔۔ میرے بخت جہان کے ہوتے ہوئے تو تم میری ہی زمینوں کو شریکوں کے سُپرد نہیں کرو گے۔ دستخط نہیں کرو گے۔۔۔''[43]

سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لکھے گئے ان ناولوں نے قاری پر مختلف حقائق کو منکشف کیا۔ حکمرانوں کی غلط پالیسیوں نے پاکستان کو دو لخت کر دیا اور ملکی سلامتی کو نقصان پہنچایا۔ لسانی جھگڑے ہوں یا ملکی باہمی کی تحریک۔ان ناول نگاروں نے ایک ایک واقعے کی تفصیل کو نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ چشم کشا واقعات کو بھی

احاطۂ تحریر میں لائے ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان موجود خلیج، فوج کا کردار اور عوام کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے بیانیے کے طور پر یہ ناول ایک عمدہ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

## حوالہ جات


1۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، سقوطِ مشرقی پاکستان (لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۲ء)، ص ۴۲۔

2۔ بشیر بدر، ڈاکٹر، سقوطِ مشرقی پاکستان اور اُردو ادب (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۳۔

3۔ توصیف احمد خان، آدھا پاکستان (لاہور: نگارشات، ۲۰۰۴ء)، ص ۸۷۔

4۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۲۵۔

5۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے (ملتان: کاروان ادب، ۱۹۸۶ء)، ص ۳۰:۳۱۔

6۔ ایضاً۔

7۔ ایضاً، ص ۹۶۔

8۔ بشیر بدر، ڈاکٹر، سقوط مشرقی پاکستان اور اُردو ادب، ص ۵۹۔

9۔ سلمیٰ اعوان، تنہا (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۶۸۔

10۔ ایضاً، ص ۷۷۔

11۔ ایضاً، ص ۷۹۔

12۔ ایضاً۔

13۔ ایضاً، ص ۹۲۔

14۔ ایضاً، ص ۹۵۔

15۔ ایضاً، ص ۹۷۔

16۔ ایضاً، ص ۹۹۔

17۔ ایضاً، ص۱۰۴۔

18۔ ایضاً، ص۱۰۶۔

19۔ ایضاً، ص۲۶۰۔

20۔ ایضاً، ص۳۰۸۔

21۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص۷۸۰۔

22۔ ایضاً، ص۷۹۳: ۷۹۴۔

23۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص۱۵۴۔

24۔ ایضاً۔

25۔ رضیہ فصیح احمد، ڈھیروں کی زنجیر (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۵ء)، ص۱۰۰۔

26۔ ایضاً، ص۱۰۱۔

27۔ ایضاً، ص۱۲۳۔

28۔ ایضاً، ص۱۳۳۔

29۔ ایضاً، ص۱۴۴۔

30۔ ایضاً، ص۱۶۷۔

31۔ ایضاً، ص۵۵۵۔

32۔ منشایاد، ''مٹی آدم کھاتی ہے: نئی طرز کا دلچسپ ناول''، مشمولہ: منشائے (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۳ء)، ص۶۵۔

33۔ حمید شاہد، محمد، مٹی آدم کھاتی ہے (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء)، ص۲۴۔

34۔ ایضاً، ص۷۶۔

35۔ ایضاً، ص۸۱۔

36۔ خالد فتح محمد، خلیج (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص۱۸۔

37۔ ایضاً، ص ۲۰۔

38۔ ایضاً، ص ۲۴۔

39۔ اایضاً، ص ۵۷۔

40۔ ایضاً، ص ۷۲۔

41۔ ایضاً، ص ۸۱۔

42۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

43۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۷۰۴۔